باسمہٖ تعالیٰ

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

آدمِ نو کی تخلیق

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں
علّامہ غلام احمد پرویز صاحب کا خطاب

.....

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

آدمِ نو کی تخلیق

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

رفیقانِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت

امسال بے پناہ سیلابوں نے جو قیامت برپا کی، اور کم و بیش سارا ملک تباہی اور بربادی کے جن طوفانوں کی لپیٹ میں آگیا، اس سے مجھے اندیشہ تھا کہ ہمارے اس سالانہ اجتماع میں بھی شرکاء کی تعداد متاثر ہوگی، لیکن میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا، اور آپ احباب، حسبِ معمول، جس ذوق و شوق سے، کارواں در کارواں کنونشن میں شرکت کے لیے تشریف لائے اس نے ایک بار پھر اس حقیقت کو درخشندہ سے درخشندہ تر کر دیا کہ آپ کا جذبہ کس قدر صادق، اور آپ کا ولولہ کس قدر محکم اور پائیدار ہے جو حوادثِ ارضی اور سماوی کے ایسے دشوار گذار موانع بھی آپ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ آپ غور فرمایئے کہ اس تقریب میں کونسی جاذبیت ہے جو آپ کو صعوباتِ سفر کی پرواہ کیے بغیر، رواں دواں اس کی طرف کھینچ لاتی ہے؟ یہ نہ کوئی (عرفِ عامہ میں) مذہبی تقریب ہے جس میں "ثواب" کا لالچ موجبِ کشش بنتا ہے، اور نہ کوئی (دورِ حاضرہ کا) سیاسی اجتماع جس میں دنیاوی مفاد کی مقناطیسی جاذبیت دامن کش ہوتی ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام سے وابستگی، اور اُس کی اِس قسم کی تقریبات میں شرکت میں ایثار ہی ایثار ہے۔ کوئی دنیاوی منفعت (پیش پا افتادہ یا مستقبل میں متوقع) مضمر نہیں ہوتی۔ اس تمام زحمت کشی اور صعوبت انگیزی، مفاد فراموشی اور ایثار شعاری کا جذبۂ محرکہ ایک اور صرف ایک ہے..... یعنی خدا کی کتابِ عظیم سے والہانہ عشق اور اس حقیقت پر ایمانِ محکم کہ اس کی روشنی میں قائم کردہ نظام ہی میں نوعِ انسان کی نجات و سعادت کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی وہ عشق ہے جو آپ احباب کو اتنے دور دراز گوشوں سے کھینچ کر، اس مرکزِ قرآنی میں، یوں یک جا کر دیتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی کوئی تفریق و تمیز باقی نہیں رہتی، اور ..... تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے..... کا فردوسی منظر وجہٗ نورانیتِ قلب و نگاہ بنتا ہے۔ خدا کی اس عظیم کتاب کا یہ کتنا بڑا احسان ہے جس سے ہم کسی صورت میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل نسیمِ صبح! تیری مہربانی

اسی لیے تو ارشادِ خداوندی ہے کہ

بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ (49/17)

یہ خدا کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے تمہاری راہ نمائی منزلِ ایمان کی طرف کر دی۔

عالم گیر فساد

عزیزانِ من! جیسا کہ آپ نے میرے آج کے خطاب کے موضوع سے اندازہ لگالیا ہو گا، میرے پیشِ نظر اس تباہی کا دِلسوز اور جگر خراش تذکرہ ہے جو نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود ہے اور نہ کسی خاص قوم یا مملکت سے مخصوص۔ یہ اس جہنم کا جاں سوز قصہ ہے جس میں آج پورے کا پورا عالمِ انسانیت جھلس رہا ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اپنے سامنے نہیں پاتا۔ قرآنِ کریم نے اپنے زمانۂ نزول کی عالم گیر تباہی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30/41)

کرۂ ارض پر، خشکی اور تری میں، ہر جگہ فساد برپا ہے اور یہ سب، لوگوں کا اپنا کیا کرایا ہے۔

اس کے ذمہ دار خود اِن کے خود ساختہ نظامِ حیات ہیں۔

اُس زمانے میں، دنیا میں روم اور ایران کی دو سب سے اہم تہذیبیں تھیں۔ اور یہ دونوں پستیٔ اخلاق و کردار کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکی تھیں، ان پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ لیکن دنیا کی جو حالت آج ہو چکی ہے، اس میں اِس فساد کی وسعتیں حدود فراموش اور طغیانیاں ساحل نا آشنا ہیں۔ آج، وسائل رسل و رسائل کی عمومیت اور ذرائع مواصلات و ابلاغ کی عالمگیریت سے، ساری دنیا سمٹ کر، ایک قطعۂ ارض بن گئی ہے جس میں اُن انسانیت سوز خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی شکل اختیار کر چکے ہیں جن سے اس کا کوئی کونہ کھدرا تک محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ کریم نے ایک آنے والے دَور کے متعلق کہا تھا کہ كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا (76/7) ''اس میں شر کی چنگاریاں فضا میں اڑتی پھریں گی''۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں، ہمارے ہی دَور کی طرف اشارہ ہے جس میں اقبالؔ کے الفاظ میں کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ..... شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب ..... اس میں مشرق و مغرب سب اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ اس میں حالت یہ ہے کہ ..... عالم ہمہ ویرانۂ چنگیزیٔ افرنگ ..... اور اس کی وجہ سے، یا یوں کہیئے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ..... نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری ..... بہر حال یہ ہے وہ عالمگیر تباہی کا جہنم جس میں آج ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا اس قسم کا منظر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے کہا تھا کہ

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

یورپ کا واویلا

یہ آج سے کوئی چالیس سال پہلے کی بات ہے، لیکن اس کے بعد، یورپ کے جراحت ہائے پنہاں کے درد کی شدت اس قدر بڑھ گئی کہ اس کی چیخ و پکار نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد رابرٹ برفو نے لکھا تھا کہ (اس خطاب میں کئی باتیں ایسی بھی آئیں گی جنہیں میں اس سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں، لیکن دنیا کے حالات اس قدر ابتر ہوتے جا رہے ہیں کہ انہیں بار بار دُہرانے کی ضرورت ہے):

> یہ جنگ مع اپنے تمام بہیمانہ مظاہروں کے جن کی وجہ سے آج ہمارا شعور گونا گوں دہشت انگیزیوں کا مسکن بن رہا ہے، کوئی ہنگامی یا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ تمام مجرمانہ حماقتیں، تمام منافقتیں، تہمت تراشیاں اور دروغ بافیاں، یہ تمام سنگ دلانہ حرکات، انسانی زندگی اور قوت اور دولت کی یہ تمام بربادی اور دہشت انگیز تباہی، غرضیکہ یہ پورے کا پورا پاگل پن اور اس کا ایک ایک عنصر، ہماری قبل از جنگ کی مغربی تہذیب کے اندر موجود تھا۔ جنگ دراصل ان تمام مذموم افعال اور نفرت انگیز اعمال کا مرئی اوتار

یا محسوس مظاہرہ تھا جن کی مسموم فضا میں ہم گھرے ہوئے تھے۔ جنگ نے صرف اتنا ہی کیا کہ ان بھیانک چہروں سے نقاب اُلٹ دیا۔

(The Making of Humanity)

اُسی دور کے ایک ماہرِ تجزیہ نفس، ڈاکٹر ولیم سٹیکل نے لکھا تھا:

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جرائم عام ہو چکے ہیں۔ چوری ایک مہذّب ہنر بن چکی ہے، صرف اس کا نام بدل دیا گیا ہے۔ اب اسے کاروبار (بزنس) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ قتل ایک عام بات ہو چکی ہے۔ سرمایہ شہنشاہِ مطلق ہے۔ جنگ سے سہل انگاری عام ہو چکی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ کسی طرح مفت میں دولت ہاتھ آجائے اور کام نہ کرنا پڑے۔ اخلاق کا معیار بہت پست ہو گیا ہے۔ معاشرہ کی شرم کا اب احساس تک نہیں رہا۔ اب شرم صرف اسے آتی ہے جو دوسروں کا خون چوسنے میں ناکام رہ جاتا ہے۔ جنگ کے بعد قمار بازی کا چسکا عام ہو گیا ہے، حتیٰ کہ اب وہ جنون کی کیفیت اختیار کر چکا ہے۔ جوئے کی سینکڑوں مہذب قسمیں ایجاد ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی شراب خوری۔ اس سے بوڑھے، بچے سب کی قوتِ عمل تباہ ہو جاتی ہے اور لوٹ مار، اور تباہ کاری کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔

(Peculiarities of Behaviour)

آپ غور کیجیے عزیزانِ من! اگر میں یہ نہ بتاتا کہ اس میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد، اقوامِ مغرب کا نقشہ کھینچا گیا ہے، تو آپ یہی سمجھتے کہ یہ خود پاکستان کا تذکرہ ہو رہا ہے! بہر حال، اس اخلاقی پستی کا آغاز پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہوا، اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی ..... حتیٰ کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ خرابیاں انتہائی شدت اختیار کر گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں لارڈ سنل کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی The New World ۔ اس میں اس نے لکھا تھا:

نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دَور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول و طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی خاص مقصد کے لیے،،،،، کبھی خام پیداوار کے لیے، کبھی خام منڈیوں کی تلاش میں، کبھی دفاعی موقف کی غرض سے..... لیکن گذشتہ جنگ کو دیکھیے، اس کی ظلمت انسانی قلوب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی..... نسلی تفاخر، تغلب و تسلط کے جذبات، اور مملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔

لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانہ پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں..... نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔

یہ تو ہے انسانی معاشرہ کی اجتماعی تباہ کاریوں کا تذکرہ۔ اس معاشرہ کے اندر خود فرد کی کیا حالت ہے، اس کے متعلق مشہور امریکی مفکّر ممفورڈ لکھتا ہے کہ

ہم تاریخ کے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں انسان خود اپنا بدترین دشمن بن چکا ہے..... مغربی کلچر انسان کا ترجمان نہیں رہا۔ یہ انسان سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور خود انسان کا دشمن ہے..... اس تہذیب کے خلاف اس سے شدید تر تنقید اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ علاوہ اس کے کہ اس کے ذریعے انسان اپنے اوپر آپ تباہیاں لا رہا ہے، اسے انسانی زندگی سے کچھ دلچسپی نہیں..... اس تہذیب کا ماحصل یہ ہو گا کہ اس قسم کے مشینی انسان پیدا ہوں گے، جو نہ اپنے لیے آپ فیصلہ کر سکنے کے قابل ہوں گے اور نہ ہی زندگی کی شاہراہ متعین کر سکنے کے اہل۔ (The Conduct of Life)

ہمارے زمانے میں، علمِ تجزیۂ نفس (Psycho Analysis) انسان کی اندرونی دنیا سے متعلق مسائل کی بنیادی وجوہات کے سلسلہ میں بڑی تحقیق کر رہا ہے۔ اس فن کے مشہور ماہر، ڈاکٹر ینگ نے ہزار ہا مریض نوجوانوں کے تجزیۂ نفس کے بعد ایک کتاب لکھی (Modern Man in Search of Soul)۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے:

> عصر حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ سے ہراساں۔ یعنی ان وحشی قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دَور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور سے قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت۔ اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے جہاں تخریب و تعمیر کی قوتیں ہر وقت ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اُسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

یہ وہ تاریکیاں ہیں جن کے متعلق اقبال نے، ابلیس کی زبان سے، کہلوایا تھا کہ

تو نے کیا دیکھا نہیں، مغرب کا جمہوری نظام　　چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

خود اقبال نے اس بدنصیب انسان کے قلبی اضطراب کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

> وہ اپنے فکر کی دنیا میں خود اپنی ذات کے خلاف ستیزہ کار رہتا ہے۔ اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف نبرد آزما.....اور نہ اپنی کف بدہاں سرکشی کو ضبط میں لا سکتا ہے، اور نہ ہی ہوسِ زر پرستی کی ناقابلِ تسکین تشنگی کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا.....یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے تمام بلند مقاصد کو (ایک ایک کر کے) تباہ کر رہی ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہیں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں بیزار ہے۔ وہ نگاہ فریب مناظر میں جذب ہو کر اپنی ذات کی گہرائیوں سے یکسر منقطع ہو چکا ہے۔ اس کی منظم مادہ پرستی کے میدان میں اس کی توانائی پر وہ فالج گر چکا ہے جسے لکسلے کی نگاہ نے بھانپا اور اس پر اظہارِ تاسف کیا تھا۔
>
> (خطبات ص ۱۷۷)

انہوں نے عصر حاضر کے انسان کی اس کیفیت کو بالِ جبریل میں دو مصرعوں میں اس طرح سمٹا کر بیان کیا ہے کہ

تجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے　وہ آزادی　　کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

میں چاہتا تو اس موضوع پر بیسیوں شہادات کا اضافہ کر سکتا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک تو اس لیے کہ قلّتِ وقت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اور دوسرے اس لیے کہ یہ اخلاقی پستیاں، یہ تباہیاں اور بربادیاں، ہمارے لیے اب جگ بیتی نہیں رہیں، آپ بیتی بن چکی ہیں۔ یہ سب ہمارے ہاں کی روزمرہ کی زندگی کا معمول بن چکی ہیں۔ جن کے ہاتھوں ہم میں سے ہر شخص نالاں ہے، لیکن ان کا کوئی مداوا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لہٰذا مجھے، مزید شہادات پیش کیے بغیر آگے بڑھ جانا چاہیئے، یہ دیکھنے کے لیے کہ ان مفکرین کے نزدیک، ان تباہیوں کا بنیادی سبب کیا ہے، یہ بات بڑے غور سے سننے اور سمجھنے کے قابل ہے۔

مسیحی مفکر، شین نے اپنی ایک کتاب (فلاسفی اوف ریلیجن) میں ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ

> یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق تاریخ سے کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی سائنٹفک زاویۂ نگاہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایسے مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بنیادی اور ابدی صداقتوں میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کے مطابق تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ جب اٹھارویں صدی میں نیوٹن کے نظریہ کے ماتحت خارجی کائنات کے متعلق ایک نیا تصور قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس کا بھی تقاضا شروع ہو گیا کہ اب دنیا کو مذہب بھی نیا ملنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے مطابق ایک نیا مذہب بھی پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے تقاضا کیا کہ اخلاقیات، ادب اور مابعد الطبیعیات کو اپنے بنیادی اصول اور جوہر بدل لینے چاہئیں تاکہ وہ اس سائنٹفک زاویۂ نگاہ کے مطابق ہو جائیں۔ (P. 7)

شین نے تو نیوٹن کی مثال دی ہے۔ خود ہمارے زمانے میں جب آئن سٹائن نے نظریۂ اضافت (Relativity) پیش کیا تو ویسٹر مارک نے کہا تھا کہ اخلاقیات کو بھی اضافی (Relative) ہونا چاہیئے، نہ کہ مطلق (Absolute) ۔ بالفاظِ دیگر بات یہ کہی گئی کہ خارجی کائنات کے متعلق سائنس کے انکشافات جو تصور پیش کریں، اخلاق اقدار کو بھی انہی کے مطابق ڈھلتے اور بدلتے رہنا چاہیئے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں، یورپ میں مادّہ (Matter) کے متعلق بڑے وسیع پیمانے پر سائنسی تحقیقات ہوئیں۔ انہی میں نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) بھی تھا۔ یہ نظریہ اس حد تک تو صحیح تھا کہ زندگی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، اوّلیں جرثومہ سے درجۂ حیوانات تک پہنچی ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ بھی کہا گیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح، طبیعی جسم سے عبارت ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اس کا دماغ، دیگر حیوانات کے مقابلہ میں ذرا بڑا ہے، اس لیے اس میں عقل و شعور کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی زندگی بھی طبیعی قوانین کے تابع ہے..... یہ بھی عام حیوانات کی طرح، کھاتا پیتا، افزائشِ نسل کرتا ہے اور اس کے بعد موت اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

اس کا سبب

اس باطل نظریہ کا اثر، انسانی زندگی پر کیا پڑا، یہ چیز قابلِ غور ہے اور موجودہ عالم گیر انسانی تباہیوں کا بنیادی سبب۔ حیوانات کا مقصد اپنے آپ کو زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے انہیں طبیعی سامانِ زیست (کھانے پینے کی چیزوں) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ضروریات کے پورا کرنے کے لیے ان کے سامنے جائز اور ناجائز کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ (مثلاً) ایک بھوکا بیل باہر جاتا ہے تو جو کھیت سب سے پہلے اس کے سامنے آتا ہے وہ اس میں سے چرنے لگ جاتا ہے، بلا تمیز اس کے کہ وہ کھیت اس کے مالک کا ہے یا کسی اور کا..... اپنے کھیت اور دوسرے کے کھیت کی یہ تمیز انسانی سطح کا خاصا ہے۔ حیوانی زندگی میں یہ امتیاز ہوتا ہی نہیں۔ اسی تمیز و تخصیص کو "جائز اور ناجائز" میں فرق کہا جاتا ہے، اور اسے اصطلاح میں قدر (value) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اقدار کا تصوّر انسانی سطح کا خاصہ ہے۔ حیوانات میں یہ چیز مفقود ہوتی ہے۔ وہ، اقدار کے تصور سے نا آشنا ہوتے ہیں۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ یورپ کی سائنسی تحقیقات نے یہ تصور پیدا کیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے۔ اس نظریہ کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کے سامنے اقدار کا تصوّر نہ رہا۔ اس نے بھی زندگی کا مقصد، اپنی طبیعی ضروریات کا پورا کرنا سمجھ لیا، اور بس۔

اقبال کے الفاظ میں

در نگاہش آدمی، آب و گِل است　　کاروان زندگی بے منزل است

قرآنِ کریم نے اس نظریہ کو کفر کہہ کر پکارا ہے، اور اس کا نتیجہ جہنم۔ سورۂ محمدؐ میں ہے:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ

(47/12)

جن لوگوں کا تصوّر زندگی حیوانات کی طرح کھانا پینا اور دیگر سامانِ زیست سے متمتع ہونا ہے، اور بس،

وہ کفر کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زندگی کا نتیجہ جہنّم ہے۔

اس آیت سے دو اہم نکات سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اقدار کا تصوّر، کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز ہے۔ جس زندگی کا مقصد محض طبیعی ضروریات کا پورا کرنا ہے، وہ کفر کی زندگی ہے۔ اسلام کی زندگی وہ ہے جس میں اقدار کی پابندی مسلکِ حیات ہو۔ اور دوسری بات یہ کہ اقدار کو نظر انداز کر دینے سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ عذابِ جہنم میں مبتلا ہو گا..... اس دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی..... اِس دنیا کا جہنم ہم سب کے سامنے ہے۔

سیکولرازم

اقوامِ مغرب نے اپنے نظامِ سیاست کی بنیاد اس (جدید) نظریۂ حیات پر رکھی۔ اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں مطلق اور غیر متبدل اقدار کا تصوّر نہیں ہوتا۔ اپنی تمدنی زندگی کے لیے معاشرہ جس قسم کے قوانین چاہے مرتب کر لے۔ لیکن مارکس اس سے ایک قدم آگے بڑھا۔ اس

نے اس حیوانی نظریہ پر اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھی، جسے کمیونزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ اخلاق و اقدار کے تمام تصوّرات، عہدِ پارینہ کی فرسودہ کہانیاں ہیں جو جہالت اور توہم پرستی کی پیدا کردہ ہیں۔ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے.....فیوربا خ (Ludwig Feurebach) کے الفاظ میں:

MAN IS WHAT HE EATS.

یعنی "انسان عبارت ہے اس سے جو کچھ وہ کھاتا ہے"۔ (Essence of Christianity)

خود مارکس نے اپنی کتاب (کیپٹل، جلد اوّل) میں لکھا کہ

> اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات، اور اسی قسم کے دیگر نظریات کا آزادانہ وجود کوئی نہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ ان کا کوئی نشوو ارتقا نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنی مادی پیداور اور مادی روابط کی نشوونما کے ساتھ ساتھ، اپنے خیالات، اور ان خیالات سے پیدا شدہ تصورات کو بدلتا رہتا ہے۔ (انہی کا نام عقائد و اخلاقیات اور اقدار ہیں۔)

مارکس کے رفیقِ اوّل، اینگلز نے کہا کہ

> (ہمارے فلسفۂ حیات کی رُو سے) دنیا میں کوئی شے حرفِ آخر، مطلق یا مقدس نہیں۔ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے اور پیچھے سے آئی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اور لینن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ

> ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ تصوّر جاگیرداروں اور سرمایہ کاروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر، محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لیے وضع کیا گیا ہے.....سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق، احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اُسے مانتے ہی نہیں.....ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کیے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔ (ان اقتباسات کے حوالوں کے لیے، میرا پمفلٹ.....اسلامی سوشلزم، ملاحظہ فرمایئے۔)

مختصر الفاظ میں، کمیونزم نے یہ تصور عام کیا کہ انسان کا سارا مسئلہ روٹی کا ہے اور اس مسئلہ کا حل، تمدن و سیاست کا بنیادی اور منفرد فریضہ ہے، خواہ وہ کسی طریق سے ہو۔ کمیونسٹ ممالک میں تو اس تصور کا عام ہونا فطری امر تھا، لیکن کمیونزم کے پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جو ممالک کمیونزم کے مخالف ہیں، ان میں بھی یہ تصوّر عام ہو گیا ہے۔ یعنی اس وقت دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسانی زندگی کا سارا مسئلہ "روٹی، کپڑا اور مکان" نہ قرار پا گیا ہو۔ اس میں کمیونسٹ ممالک اور غیر کمیونسٹ ممالک، مسلم مملکتیں اور غیر مسلم مملکتیں، مغربی اقوام اور مشرقی اقوام، سب شامل ہیں.....روٹی، روٹی، روٹی، ہر ایک کی زبان پر ہے۔ اقدار کا لفظ تک کہیں سنائی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے دیکھیئے تو مارکس بڑا کامیاب ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کا پیش کردہ نظریۂ حیات تسلیم کر لیا جائے۔ سو ایسا ساری دنیا میں ہو گیا ہے۔ سعدی نے کہا تھا کہ

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

اُس قحط سالی میں تو معلوم نہیں کہ عشاق نے عشق فراموش کر دیا تھا یا نہیں۔ لیکن ہمارے زمانے نے تو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ روٹی کے مسئلہ نے اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ عالم گیر نوعِ انسان یکسر اقدار فراموش ہو گئی ہے۔ آج نہ کسی کا روٹی سے بلند کوئی مطالبہ رہ گیا ہے، نہ دعویٰ کرنے والے روٹی مہیّا کرنے کے علاوہ کوئی وعدہ کرتے ہیں۔ سوچیئے کہ یہ رشتہ، کمہار اور اس کے گدھے کے رشتے سے ذرا بھی مختلف اور بلند ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ روٹی کا مسئلہ اپنی جگہ بڑا اہم ہے کیونکہ انسان کی طبیعی زندگی کا مدار اس پر ہے۔ لیکن یہ مقصود بالذات نہیں.....ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ بلند مقصد ہے غیر متبدل اقدار کا تحفظ۔

اقبال کے الفاظ میں

نگر خود را بہ چشمِ محرمانہ　　نگاہِ ما ست ما را تازیانہ
تلاشِ رزق ازاں دادند مارا　　کہ باشد بہرِ کشودن رابہانہ

(ارمغانِ حجاز)

اسی کا مفہوم اس نے اُردو شعر میں اس طرح بیان کیا تھا کہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی　　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اگر روٹی کا مسئلہ مقصود بالذات بن جائے تو یہ (قرآن کی رو سے) کافرانہ تصوّرِ حیات ہو گا جس کا نتیجہ جہنم.....اس سے انسان، حیوانی سطحِ زندگی پر اُتر آئے گا جس میں "جنگل کا قانون" مسلکِ حیات قرار پا جائے گا۔ یہی وہ مسلکِ حیات ہے جس سے آج ساری دنیا کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد　　دانہ ایں می کارد آں حاصل برد
از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است　　از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است
شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است　　پردۂ آدم دری، سوداگری است

(پس چہ باید کرد)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ موجودہ عالمگیر تباہی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انسان، حیوانی سطحِ زندگی اختیار کر چکا ہے جس کی وجہ سے بلند انسانی اقدار کا تصوّر گم ہو گیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا احساس خود اقوامِ مغرب کے مفکرین کو بھی ہو رہا ہے۔ لارڈ سنل (جس کی کتاب کا اقتباس شروع میں پیش کیا جا چکا ہے) موجودہ دَور کی تباہ کاریوں کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ

ریب و تشکیک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

اخلاقی اقدار کا ابدی اور غیر متبدل ہونا ضروری ہے۔ اس قسم کی اقدار صرف وحی کی رُو سے مل سکتی ہیں اور وحی اپنی منزہ شکل میں آج، اس آسمان کے نیچے، قرآن مجید کے سوا کہیں نہیں.....لہٰذا، تباہیوں کے موجودہ جہنم سے نکلنے کے لیے سب سے پہلی شرط، ان اقدار کی صداقت پر یقینِ محکم ہے۔ اسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان کی اہمیت کس قدر ہے، اس کے لیے مغربی مفکر الفریڈ کوبن کی یہ شہادت سامنے لائیے کہ

جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان، ایمان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے، اسے دورِ حاضر کے نوجوانوں کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس تلاش میں مضطربانہ پھر رہے ہیں کہ کوئی ایسی شے مِل جائے جس پر ایمان لایا جائے۔

(ان حوالوں کے لیے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" دیکھیئے۔)

ایمان کے لیے انسان کی اس مضطربانہ تلاش کی کیفیت کیا ہے، اس کے لیے مغرب کے مشہور فلاسفر پسکال کے یہ الفاظ گہری توجہ کے محتاج ہیں۔ اس نے لکھا ہے:

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے محبت کرنے پر مجبور ہے۔ جب اسے ایمان اور محبت کے لیے کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بے کار اور خراب مقاصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے۔ اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے اور اچھے

نصب العینوں سے دست کش ہو جائے تو بُرے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔.....وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ موت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔

ایمان کسے کہتے ہیں؟

ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ اقدار، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ مسلم اقوام ہوں یا غیر مسلم، یہ اقدار کسی کے سامنے بھی نہیں۔ ان سب کے نزدیک، اصل مسئلہ صرف روٹی کا رہ گیا ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم اقوام میں سے ہر قوم ہی نہیں، ہر فرد اس کا مدعی ہے کہ قرآن پر اس کا ایمان ہے۔ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسلم اقوام نے بھی ان اقدار کو چھوڑ کر حیوانی (کافرانہ) زندگی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ یہ تو کھلا ہوا تضاد ہے! لیکن اس میں کوئی تضاد نہیں.....اصل یہ ہے کہ جسے ہم عام طور پر "ایمان" کہتے ہیں، وہ درحقیقت ایمان نہیں۔ لفظِ ایمان کا زبان سے ادا کر دینا ہے۔ قرآن کے الفاظ کو زبان سے دُہراتے رہنے کا نام ایمان رکھ لینا فریبِ نفس ہے۔ اور ہم سب اسی فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔

آج کے رانجھے، آج کے مجنوں، سب لفظوں سے کھیلنے والے
بھول گئے محمل والے کو، وردِ زباں ہے، محمل محمل

اس فریبِ نفس کے لیے ہم نے اپنی زبان میں ایک لفظ وضع کر رکھا ہے جو ہماری نگاہ کو حقیقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ جس سے پوچھیے وہ کہہ دے گا کہ میں "خدا کو مانتا ہوں۔ خدا کی کتاب کو مانتا ہوں"۔ ہم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اس "مانتا ہوں" کا مفہوم کیا ہے؟ غور کرنے پر نظر آجائے گا کہ یہ صرف دو لفظ ہیں جنہیں دہرا دیا جاتا ہے۔ درحقیقت ان سے مفہوم و مطلوب کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہیں اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔ اور اس کی کتاب پر ایمان کا مطلب ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ جس ایمان کی شہادت انسان کا عمل نہیں دیتا، اس ایمان کا کچھ فائدہ نہیں۔ سورۂ انعام میں ہے کہ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا (6/159) جس شخص کے ایمان کے ساتھ عملِ خیر شامل نہیں ہو گا، اس کا ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ (آمَنَتْ مِن قَبْلُ کی بحث کا یہ موقع نہیں۔) اقبال کے الفاظ میں.....مردد آں ایماں کہ ناید در عمل..... سمجھنے کی خاطر یوں کہیئے کہ ایمان، کیمسٹری کا ایک فارمولا ہے جس کے مطابق لیبارٹری میں عمل کر کے وہ نتیجہ پیدا کیا جائے گا جس کے لیے وہ فارمولا وضع اور مرتب ہوا تھا۔ اگر آپ اس فارمولا کو سنہری حروف میں لکھ کر حریر و اطلس کے جزدانوں میں لپیٹ رکھیں گے، یا صبح و شام اس کے الفاظ کو دہراتے رہیں گے، تو کیا اس سے وہ نتیجہ مرتب ہو جائے گا؟ قیامت تک نہیں ہو گا۔ دعویٰ ایمان بلا عمل کی یہی مثال سمجھیئے۔

قتلِ مومن

موجودہ مسلم اقوام کے دعوئے ایمان کی حالت کیا ہے، اس کے لیے مثالیں تو بہت سی دی جا سکتی ہیں لیکن میں یہاں صرف اس ایک مثال پر اکتفا کروں گا جو اس وقت ہم سب کے سامنے ہے اور جس نے ہمارے سینوں کو چھلنی کر رکھا ہے۔ سورۂ النساء کی یہ آیت کس مسلمان کے سامنے نہیں جس میں کہا گیا ہے کہ

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (4/93)

جس مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔
اس پر اللہ کا غضب ہو گا اور اس کی لعنت۔ خدا نے اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ایک مسلمان کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کے انفرادی قتل کو تو چھوڑیئے۔ جو کچھ آج مشرقِ وسطیٰ میں ہو رہا ہے اور جس میں مسلمان افراد ہی نہیں، مسلمان قومیں ایک دوسرے کے قتل میں مصروف ہیں (اور ظاہر ہے کہ جنگ میں قتل بالارادہ ہوتا ہے) وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے

کہ کیا اِن، باہمی قتال میں مصروف مسلمان قوموں کا قرآنِ مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟ میں کہتا ہوں کہ (سارے قرآن کو چھوڑیئے) اگر مسلمان اقوام کا قرآنِ مجید کی اس ایک آیت پر ہی ایمان ہوتا، تو ہماری تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا!

سازش

میں اپنے موضوع سے ذرا دُور ہٹ جاؤں گا لیکن جب بات سامنے آگئی ہے تو اس پر گفتگو کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ آیت آپ کے سامنے ہے۔ اس کا مطلب اور مفہوم اس قدر واضح ہے اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں، مسلمانانِ عالم گذشتہ تمام صدیوں میں، ایک دوسرے کے خلاف مصرفِ قتال کیوں رہے؟ کیا ان کے دل میں ذرا سا بھی خدا کا خوف پیدا نہ ہوا؟ کیا وہ خدا کے غضب اور لعنت اور عذابِ عظیم کی طرف سے اس قدر نڈر ہو گئے کہ وہ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں ایک دوسرے کو قتل کرتے، اور اس پر فخر کرتے رہے، اور کر رہے ہیں! اس کا جواب بڑا واضح ہے۔ یہ اُس سازش کی وجہ سے ہوا ہے جسے ہم اپنی تاریخ کے مقدس نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس تاریخ میں اس قسم کے افسانے وضع کر کے رکھ دیئے گئے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے صرف پچیس چھبیس سال بعد، پوری کی پوری اُمت، جو صحابہ کبارؓ اور تابعینؒ پر مشتمل تھی، جنگِ جمل کے میدان میں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہو گئی، اور اس دن، بعض روایات کے مطابق دس ہزار، اور بعض کے مطابق تیس ہزار مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے جن میں اولوالعزم صحابہؓ بھی شامل تھے۔ پھر اس سے اگلے سال، باقی اُمت، صفین کے مقام پر ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو گئی۔ (تاریخ کی رُو سے) اس فوج میں ایک طرف، ستر اصحابِ بدر، اور بیعتِ رضوان کی سعادت حاصل کردہ سات سو صحابہؓ اور چار سو کے قریب دیگر مہاجر و انصار (صحابہ) شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ دوسری طرف بھی ایسی ہی صورت ہو گی۔ یہ سب وہ تھے جن کے متعلق خود خدا نے فرمایا تھا کہ أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا یہ سب پکے اور سچے، حقیقی مومن تھے۔ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (8/74) ان کے لیے باعزت رزق اور مغفرت ہے۔ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ (9/100) اللہ نے ان کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے۔ ہماری اس افسانوی تاریخ نے ان سب کو، ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں لا کھڑا کیا۔ اس جنگ میں، روایات کی رُو سے، قریب ستر ہزار مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ فرمایئے! تاریخ کی اس شہادت کے بعد، اس آیت کا کیا وزن اور اثر باقی رہ جائے گا جس میں کہا گیا ہے کہ جس نے کسی ایک مسلمان کو بھی بالارادہ قتل کر دیا اس کا ٹھکانا جہنم ہے؟ بعد میں آنے والوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ جب صحابہ کبارؓ اس آیت کی موجودگی میں، ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے، اور بدستور رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مستحق ٹھہرائے گئے، تو اگر ہم نے، انہی کے اتباع میں، ایک دوسرے کی گردن ماردی تو کونسا جرم ہو گیا؟ اور پھر اس سازش کی ساحری ملاحظہ ہو کہ جو شخص یہ کہہ دے کہ اس قسم کے واقعات، وضعی افسانے ہیں، جنہیں خاص مقصد کے تحت ہماری تاریخ میں شامل کر دیا گیا ہے، تو اس پر کفر کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں۔ جنہوں نے پہلے ایسا کہا تھا ان پر بھی کفر کے فتوے لگائے گئے تھے۔ جو آج ایسا کہتے ہیں ان پر بھی کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ ایسا کرنے والے، قرآنِ مجید کی اس آیت کو بھی مانتے ہیں جسے میں پہلے درج کر چکا ہوں اور اسے بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں نے (جن کے مومن حقا ہونے کی شہادت اور مستحقِ جنت ہونے کی بشارت خود خدا نے دی تھی) لاکھوں کی تعداد میں ایک دوسرے کو قتل کیا تھا۔ اسے کہتے ہیں کامیاب سازش!

تاریخ کو چھوڑیئے۔ آپ سوچیئے کہ جو مسلمان قومیں آج جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہیں، کیا اُن کے متعلق کہا جائے گا کہ ان کا قرآنِ مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟ (ضمناً) وہ مسلمان قومیں جو خود تو شریکِ جنگ نہیں، لیکن ان لڑنے والوں کا تماشہ دیکھ رہی ہیں، وہ بھی یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب نہ دے لیں کہ ہمارا قرآن پر ایمان ہے۔ ہم قتال کے جرم کے مرتکب نہیں۔ ان کے متعلق بھی قرآنِ کریم میں ایک ارشاد موجود ہے اور وہ یہ کہ

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (49/9)

اگر مسلمانوں کے کوئی دو گروہ باہم گر نبرد آزما ہو جائیں تو تمہارا فریضہ ہے کہ تم آگے بڑھ کر ان میں صلح کرا دو۔

جو مسلمان قومیں، مشرقِ وسطیٰ کے لالہ زاروں میں، مسلمانوں کے ہاتھوں دوسرے مسلمانوں کے قتل کو خاموش بیٹھے دیکھ رہی ہیں، انہیں سوچنا چاہیئے کہ کیا اُن کا قرآنِ مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟

عزیزانِ من! میں نے یہ مثالیں، صرف یہ بتانے کے لیے پیش کی ہیں کہ یہ کہہ دینا کہ ہمارا قرآنِ کریم پر ایمان ہے اور عملاً اس کے خلاف جانا، قرآن پر ایمان نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا آج، اقدارِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر محض روٹی کے مسئلہ کو مقصدِ حیات قرار دینے والی مسلمان مملکتیں بھی اُسی طوفان میں بہے جا رہی ہیں جن میں دنیا کی غیر مسلم اقوام وقفِ تلاطم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اور ہم سب اس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں جسے قرآنِ کریم نے اس نہجِ زندگی کا فطری نتیجہ قرار دیا تھا۔ جب تک ہم اقدارِ خداوندی کی اہمیت کو سرِ فہرست نہیں رکھتے، معاشرہ کی جن تباہ کن خرابیوں کا ہم رونا روتے رہتے ہیں، ان میں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجیئے۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی　　علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

غیر مسلم قومیں تو پھر بھی کہہ سکتی ہیں کہ ہمارے پاس وہ غیر متبدل اقدار نہیں۔ سوچیئے کہ مسلمان قومیں اس باب میں کیا کہہ سکتی ہیں؟

****

استبدالِ قومی

اب میں، عزیزانِ من! ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ قرآنِ کریم نے اُس قوم سے، جو اقدارِ خداوندی سے اعراض برتے، یہ کہا تھا کہ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (47/38) اگر تم اِن اقدار سے اسی طرح اعراض برتتے رہے، تو تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ یعنی ایسی قومیں جو ناقابلِ اصلاح حد تک پہنچ چکی ہوں، ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی قوم جو ان سے بہتر ہوتی ہے، انہیں مصافِ زندگی سے الگ کر کے، ان کی جگہ لے لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصلاحِ احوال کے اس پروگرام پر اُسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب دنیا میں ایسی قومیں موجود ہوں جو اقدار کی میزان میں دوسری قوموں سے بہتر ہوں۔ لیکن موجودہ دَور میں تو دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ اب تو دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں جس کے ہاں اقدارِ خداوندی کا تصور غالب ہو اور وہ اس معیار کے مطابق دوسری اقوام سے بہتر ہو۔ اس وقت تو کیفیت یہ ہے کہ

خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار　　سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

بلکہ اس سے بھی آگے ..... یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری ..... میں جب اس حقیقت پر غور کرتا ہوں تو بڑی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ان حالات میں، جب کہ استبدالِ قومی کا یہ پروگرام ناقابلِ عمل نظر آتا ہے، مشیت خداوندی نہ جانے نوعِ انسان کی نجات کے لیے اور کونسا طریق اختیار کرے؟ قرآنِ کریم میں ایک مقام پر یہ بھی آیا ہے ..... يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (35/15) اے نوعِ انسان! کان کھول کر سن لو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں۔ تم اُس کے محتاج ہو۔ وہ قابلِ حمد و ستائش ذات (تمام کائنات سے) مستغنی ہے۔ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ (35/16) وہ اپنے قانونِ مشیّت کی رُو سے ایسا بھی کر سکتا ہے کہ تم سب کو لے جائے (چلتا کرے) اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے۔ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ (35/17) خدا کے لیے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

انسان کا مستقبل

اس میں شبہ نہیں کہ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ موجودہ نسلِ انسانی کو معدوم کر کے، کرّۂ ارض پر کوئی نئی مخلوق بسا دے۔ اُس کے لیے ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ لیکن قرائن، اور قرآنِ کریم کے دیگر مقامات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے موجودہ انسانوں کی جگہ کوئی دوسری مخلوق لے آنا مقصود نہیں بلکہ اسی نوعِ انسانی سے ایسے افراد، گروہ یا قوم پیدا کر دینا ہے جو سیرت و کردار کی رُو سے موجودہ اقوام سے مختلف ہوں ..... اوّل تو اس لیے

کہ نسلِ آدم ابھی اپنی بھرپور جوانیوں تک پہنچی ہی نہیں۔ انسان بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے جن میں سے ہنوز عشرِ عشیر کی بھی نمود نہیں ہوئی۔ علّامہ اقبال نے اس نکتہ کی تشریح مختلف انداز واسلوب سے کی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا　　وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے

دوسرے مقام پر ہے:

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز　　گرچہ اُلجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

اور پھر ان کے وہ چار مصرعے جن میں انہوں نے اپنے مخصوص شوخ، دلآویز انداز میں حقائق کی ایک دنیا سمٹا کر رکھ دی ہے، انسان کے مستقبل کا بڑا حسین آئینہ ہیں۔ کہتے ہیں

یکے در معنیٔ آدم نگر　از من چہ می پرسی　　ہنوز اندر طبیعت می خَلد، موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے　　کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پُرخوں شود روزے

انسان کی ذات کے ارتقاء کی وسعتیں اور رفعتیں تو ایک طرف، مادی زندگی میں بھی اس کی قوتوں کی نمود کا ابھی آغاز ہوا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (45/13)

اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے لیے تابع تسخیر کر دیا ہے۔

یعنی انسان میں تسخیرِ کائنات کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ ابھی تو ان صلاحیتوں کی نمود کا آغاز ہی ہوا ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل میں نمعلوم کتنے قرن درکار ہوں گے۔ باقی رہا اس کی ذات کا ارتقاء، سو اس کی وسعتوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے الفاظ میں

عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں　　گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسّر تو کیا　　اس کو میسّر نہیں، سوز و گدازِ سجود

لہٰذا، نوعِ انسان نے کرّۂ ارض پر ابھی بے شمار منازل طے کرنی ہیں۔ ابھی تو قرآنی نظام کے متعلق وہ دَور آنا ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (9/33) وہ نظام، انسانوں کے تمام خود ساختہ نظاموں پر غالب آجائے گا..... یہ اُس زمانے میں ہو گا يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (83/6) جب عالم گیر انسانیت خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لیے اٹھ کھڑی ہو گی۔ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (39/69) اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔ یہ يَوْمُ الدِّيْن ہو گا۔ یعنی قرآنی نظام کا دَور جس کی خصوصیت یہ ہو گی کہ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا.... اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا دست نگر، محکوم، محتاج یا ''دُبیل'' نہیں ہو گا۔ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ (82/19) کیونکہ اُس وقت، جملہ امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوں گے۔ یہ دَور اسی کرۂ ارض پر، نوعِ انسان کے ہاتھوں رُونما ہو گا۔ لہٰذا خدا کے مشّت کے پروگرام کے مطابق ایسا نہیں ہو گا کہ اس سے پہلے انسان معدوم ہو جائے۔ جب تک قرآن موجود ہے، انسان معدوم نہیں ہو سکتا، کیونکہ قرآن نوعِ انسان ہی کی راہ نمائی کے لیے ہے۔ کیا خوبصورت انداز ہے کہنے والے کا جس نے کہا ہے کہ

از صد سخن پیرم، یک حرف مرا یاد است　　عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

لہٰذا، (ہمارے علم کی موجودہ سطح کے مطابق) يَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ میں خلقِ جدید سے مراد انسانوں سے الگ کوئی اور مخلوق نہیں، اسی انسان کا، اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما اور نمود، اور اقدارِ خداوندی کے مطابق اپنی داخلی دنیا میں تغیّر کی رُو سے، ایک ''نیا انسان'' بن جانا مقصود ہے۔ لفظِ خلق کے معنی ''کثرتِ استعمال کے بعد کسی چیز کا صاف اور ہموار ہو جانا، اس میں صحیح صحیح تناسب اور اعتدال پیدا ہو جانا، اس کی مناسب تربیت ہو جانا'' بھی ہیں۔ اسی کو عادات و اطوار یا خُلق کہا جاتا ہے، اسی اعتبار سے حضور نبیٔ اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (68/4) اے رسول! یہ حقیقت ہے کہ تو خُلقِ انسانی کے عظیم ترین مقام پر فائز ہے۔ حضورؐ کی یہی زندگی ہے جسے نوعِ انسان کے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے (33/21)۔ اسی

اسوۂ حسنہ کے اتباع سے، اسفل سافلین (انسانیت کی پست ترین سطح پر پہنچا ہوا آج کا انسان) "احسن تقویم" کا درخشندہ پیکر بن جائے گا (95/4-5) انہی افراد پر مشتمل وہ قوم ہو گی جو بگڑی ہوئی اقوامِ عالم کی جگہ لے گی۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے قوموں کی بعثت کے لیے بھی خلق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (7/181) وہ لوگ جنہیں ہم نے ایسی قوم بنایا ہے جو لوگوں کی راہ نمائی الحق (وحیٔ خداوندی) کے مطابق کرتی ہے اور اسی کی رُو سے ان کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہی انسان کی وہ خلقِ جدید ہے جسے اقبال "آدمِ نو" کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

نقشِ دگر طراز دِہ، آدمِ پختہ تر بیار — لُعبتِ خاک ساختن، می نہ سزد خدائے را

بلکہ اس سے بھی شوخ تر الفاظ میں کہ

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل — کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

آدمِ نو کی تخلیق

اُنہیں اس آدمِ نو کی نمود کے کچھ کچھ آثار، مفکرینِ مغرب کے افکار و تخیلات میں دکھائی دیتے تھے، جس کا اظہار انہوں نے، پیامِ مشرق کے دیباچہ میں ان الفاظ میں کیا تھا:

> یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم، اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگسان کی تصانیف میں ملتا ہے۔

آئن سٹائن کے مقابلہ میں، برگسان نے اس موضوع پر زیادہ وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ اپنی آخری تصنیف The Two Sources of Morality and Religion میں لکھتا ہے:

> آج نوعِ انسان، خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی کچلی ہوئی مصروفِ آہ و فغان ہے۔ یہ اس لیے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں کہ اس کا مستقبل خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں۔ پھر اس کے بعد یہ کہ انسان محض زندہ ہی رہنا چاہتا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر، فریضہ کائنات کی تکمیل کے لیے بھی جد و جہد کرنے کو تیار ہے۔ فریضہ کائنات کیا ہے؟ خدائی صفات کے حامل افراد کی تخلیق۔ (ص ۳۶)

آپ اِس اقتباس کے آخری الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجیے۔ یعنی "فریضہ کائنات کیا ہے؟ خدائی صفات کے حامل افراد کی تخلیق"۔ کیا یہ قرآنِ کریم کی اس آیت کا گویا ترجمہ نہیں جس میں کہا گیا ہے صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ (2/138) "خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان کہ جس رنگ سے زیادہ حسین کوئی رنگ نہیں"۔

جیسا کہ میں نے متعدد بار کہا ہے، انسان کے ہر تجربہ کی ناکامی، اس کی فکر کا رُخ اُس سمت کی طرف موڑ دیتی ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے۔ قومیں خواہ کتنی ہی بگڑ چکی ہوں، ان میں ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جو زندگی کے حقائق اور صداقت کے متلاشی ہوں۔ اور یہ حقائق اور صداقت قرآنِ مجید کے سوا کہیں موجود نہیں۔ لہٰذا کوئی زمانہ بھی اس قسم کے افراد سے خالی نہیں ہوتا۔ قرآن زندہ حقائق کا ضابطہ ہے۔ اگر ان حقائق کی جستجو اور تڑپ کہیں نہ رہے تو دنیا میں قرآن کی موجودگی بے معنی ہو جائے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔

دل ہوں گے، مگر تیری تمنا نہ رہے گی — یہ وقت جب آئے گا، تو دنیا نہ رہے گی

آج ذرائع مواصلات کے عام ہو جانے کی وجہ سے، اس قسم کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فکری رابطہ بھی پیدا کر رہے ہیں جس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک دن ایک گروپ کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یہ ہو گا وہ گروپ جو باقی انسانوں پر تیزی کے ساتھ اثر انداز ہو گا۔ روسی مفکر او سپنسکی کے استاد (یا گرو) گرجیف کے الفاظ میں

> انسانیت کا ارتقاء ایک مخصوص گروپ کی وساطت سے ہی عمل میں آسکتا ہے۔ یہ گروپ باقی نوعِ انسانی پر اثر انداز ہو گا اور اس کی راہ نمائی کرے گا۔

(All and Everything – P. 309)

بات یہاں سے چلی تھی کہ اِس وقت دنیا میں کوئی قوم بھی ایسی نہیں جو قرآن کے معیار کے مطابق، باقی اقوام سے بہتر ہو۔ اس لیے استبدالِ قومی کا طریق تو ان حالات میں ممکن العمل نہیں۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ اس کے لیے دوسرا طریق یہ ہے کہ انہی اقوام میں سے، انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے متمنی افراد اپنی جماعت متشکل کریں گے جو موجودہ اقوام سے بہتر ہو گی۔ یہ جماعت ایک اُمت کی شکل اختیار کرلے گی اور وہ غلط رو قوموں کی جگہ لے لے گی۔ یہی وہ طریق تھا جس کے مطابق، صدرِ اوّل میں اصلاحِ انسانیت کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ ظہورِ نبویؐ کے وقت بھی دنیا میں کوئی ایسی قوم موجود نہیں تھی جو قرآنی معیار کے مطابق اپنی ہمعصر اقوام سے بہتر ہو۔ لیکن ایسے افراد موجود تھے جن میں تلاشِ حقیقت کی تڑپ تھی لیکن صحیح راستہ ان کے سامنے نہیں تھا۔ انہیں صحیح راستہ دکھایا گیا تو وہ بکھرے ہوئے افراد، نسل، رنگ، زبان، وطن کی حدود و قیود سے بلند ہو کر، ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ اس طرح وہ امت وجود میں آگئی جسے اُمتِ وسطیٰ یا خیر اُمتہ کہہ کر پکارا گیا اور اس نے باقی انسانوں کی زندگی پر اثر ڈالا اور اس طرح ان کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کی۔ یہ اُس دَور کے "آدمِ نو" تھے.........باقی نسلِ انسانی سے یکسر مختلف، اگرچہ طبیعی اعتبار سے بشر'' مثلھم۔ مجھے کچھ ایسا نظر آرہا ہے کہ موجودہ حالات میں، ایک نئی قوم پیدا کرنے کا وہی طریق پھر کار فرما ہو گا، اس فرق کے ساتھ کہ اُس زمانے میں وہ مرکز، رسولؐ اللہ کی ذاتِ گرامی تھی لیکن اب اس مرکزیت کے لیے کوئی رسول یا مامور من اللہ نہیں ہو گا۔ ختمِ نبوت نے ماموریت من اللہ کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اپ یہ افراد، باہمی مشاورت سے اپنی مرکزیت آپ قائم کریں گے۔ انسانی شعور اب اتنا بالغ ہو چکا ہے کہ اگر اسے صحیح راستہ مل گیا تو پھر وہ غلط موڑ نہیں مڑے گا۔ لہٰذا اب، کائنات کا یہ بگڑا ہوا نقشہ، قرآنی راہ نمائی کی روشنی میں عام انسانوں ہی کے ہاتھوں صحیح خطوط پر مرتب ہو گا۔ اس کے لیے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں ہو گی۔ پولینڈ کے فلاسفر Berdyaeu نے اس حقیقت کو اپنے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

> یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ یہ مکمل شدہ جامد و ساکت نہیں۔ اس میں عملِ تخلیق جاری رہے گا، اور خود انسانوں کے ہاتھوں جاری رہے گا۔ اب انسان کو اپنی ممکنات سے خود پردہ کشائی کرنی ہو گی اور ہر مضمر کو مشہود کر کے دکھانا ہو گا۔ یہ عملِ تخلیق، خدا کی طرف سے انسانوں کی طرف ہی نہیں آتا بلکہ خدا خود انسانوں سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کا منتظر رہتا ہے۔

(The Divine and the Human – P. 53)

ختمِ نبوت سے یہی مقصود تھا۔ یعنی، قرآنِ کریم کے الفاظ میں، ان زنجیروں کو توڑ کر جن میں انسان جکڑا ہوا چلا آرہا تھا، اور اس کے سر پر سے ان سلوں کو اتار کر جن کے بوجھ تلے وہ کچلا جارہا تھا، اسے وہ آزادی عطا کر دینا جس سے وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری طرح نشوونما کرنے کے قابل ہوسکے۔ یہی وہ آزادی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ

> عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قرآن کے الفاظ میں وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَـٰكِنَّهُۥٓ أَخْلَدَ إِلَى ٱلْأَرْضِ وَٱتَّبَعَ هَوَىٰهُ (7/176) ہم تو چاہتے تھے کہ اسے، قرآن کے ذریعے آسمان کی بلندیوں کی طرف لے جائیں، لیکن یہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ کر، زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ توقع کی جاسکتی ہے کہ اس نَشْأَۃِ ثانیہ، اس خلقِ جدید سے انسان، اپنی حیوانی زندگی کی خاک پیوندی سے دامن چھڑا کر شرفِ انسانیت کی رفعتوں کی طرف گامزن ہو جائے گا۔ قرآن کے باقی اور محفوظ رکھنے سے یہی مقصود تھا۔

ابلیس کا چیلنج

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس قسم کے افراد ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں۔ ابلیس نے جب خدا کو چیلنج دیا تھا کہ تو نے آدم کو مجھ پر فضیلت تو دے دی ہے لیکن تو دیکھ کہ میں اولادِ آدم کو کس طرح تگنی کا ناچ نچاتا ہوں، تو اس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ جو تیرے جی میں آئے کر دیکھ، إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (17/65) میرے بندوں پر تیرا غلبہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اس "دام و دد" سے معمور کرّۂ ارض کے جنگل میں یہ "عبادی" ہی وہ سعادت بخت انسان ہیں جنہیں ہم نے "آدمِ نو" سے تعبیر کیا ہے۔ رومی نے اسی قسم کے انسانوں کی تلاش کی جدوجہد کو اس قدر بلیغ اور دلآویز پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اقبال نے ان اشعار کو، اپنی پہلی تصنیف، اسرارِ خودی کے سرنامہ کے طور پر درج کیا ہے۔ رومی نے کہا ہے کہ

وی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر　　کز دام و دد ملولم و، انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت　　شیر خدا و رستم و ستانم آرزوست!

گفتم کہ یافت می نشود، جُستہ ایم ما!

گفت آنکہ یافت می نشود، آنم آرزوست

انہی کی تلاش میں خود اقبال بھی عمر بھر مصروفِ تگ و تاز و مشغولِ نوازی رہا۔

غزل سرایم و پیغام آشنا گویم　　بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم

تلاشِ صادق شرط ہے، ڈھونڈنے والے کو یہ افراد مل سکتے ہیں۔ عالمگیر فساد کے زمانے میں، ان افراد کے ربطِ باہمی، اور مناسب تعلیم و تربیت کے لیے، داستانِ بنی اسرائیل میں ہمیں ایک اشارہ ملتا ہے، جب وہ فرعونی استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مصر میں غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے اور حضرتِ موسیٰؑ وہاں پیغامِ انقلاب لے کر پہنچے تو آپ سے کہا گیا کہ وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً (10/87) ان سے کہو کہ تم اپنے گھروں کو قبلہ بنالو، اور وہاں اپنی تربیت شروع کر دو۔ ابتداء کار کے لیے یہ چھوٹا سا گروہ، وہ ذرّۂ اولیں (First Crystal) بن جائے گا جس کے گرد اسی قسم کے دیگر افراد مرتکز ہوتے جائیں گے۔ ان میں نصب العین کی وحدت، وجہِ پیوستگی (Cementing Force) ہو گی۔ اس قسم کے گروپ کے متعلق Brightman لکھتا ہے کہ

> یہ ان آزاد لوگوں پر مشتمل ہو گا جو ایک معقول اور قابلِ قدر نصب العین کے حصول کے لیے باہمی تعاون و تناصر سے کام لیں۔ وہ نصب العین جس کی بنیادیں خدا کے ایمان پر استوار ہوں۔
> (A Philosophy of Religion)

قرآنِ کریم انہی افراد کے متعلق کہتا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (3/200)

> اے وہ لوگو! جو وحدتِ نصب العین کی صداقت پر یقین رکھتے ہو، اگر تم اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ تم میں سے ہر فرد، خود بھی ثابت قدم اور مستحکم رہے اور دوسروں کے لیے بھی اسی قسم کے ثبات و استحکام کا ذریعہ بنے۔ اور اس طرح تم سب ربطِ باہمی سے جادۂ ہدایتِ خداوندی پر گامزن رہتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ۔

تحریکِ طلوعِ اسلام

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد، عزیزانِ من! اسی قسم کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ وہ افراد جنہیں یہ یقینِ محکم حاصل ہو کہ انسانی مشکلات کا حل، قرآنِ مجید کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اب میرا روئے سخن بالخصوص ان احباب کی طرف ہے جو اس مقصد کو دل میں لیے اس تحریک

کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں، اور اب اس غرض کے لیے اس اجتماع میں شریک ہوئے ہیں کہ اس تحریک کے فروغ اور اس مقصد کے حصول کے لیے کیا کچھ مزید کیا جائے۔ یہ جذبہ بڑا مبارک اور اس قسم کی کوششیں بڑی مستحسن ہیں۔ لیکن میں اس سلسلہ میں ایک وارننگ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ قُرآنِ کریم، محض فکری وحدت کو کافی قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی وحدت وہ ہے جو قلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہو۔ جو شخص فطری طور پر اس مقصد کو صحیح سمجھ کر اپنے آپ کو اس رشتہ میں منسلک کرلے گا وہ اس گروپ میں شامل تو ہو جائے گا لیکن صرف اتنے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکے گی جسے قرآن اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (3/103) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی دِلوں کا آپس میں جڑ جانا..... اور ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کی فکر، آپ کے احساسات و جذبات کو متاثر اور متحرک نہ کرے۔ یاد رکھیئے! تنہا فکر، عمل کی محرک نہیں ہو سکتی۔ عمل کے محرک، جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ جب مختلف افراد کے جذبات، ایک جیسی فکر سے متاثر ہوں گے، تو ان میں وحدتِ کردار و عمل پیدا ہو گی۔ اسی لیے اقبال نے کہا تھا کہ..... وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام..... اس قرآنی حقیقت کی اہمیت کو اب مغربی مفکرین بھی سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے ان کا سارا زور فکری ہم آہنگی پر ہوتا تھا۔ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخِ تہذیب J.H. Denison نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے Emotion as the Basis of Civilisation۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر نے اپنے چھٹے خطبہ کے شروع میں اس کتاب کا ایک طویل اقتباس دیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں George Foot Moore لکھتا ہے:

> تہذیب کا نشو و نما اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کسی مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرے۔ اس قسم کا اتحاد، تنہا وحدتِ فکر کی بنا پر ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وحدتِ جذبات و احساسات سے ممکن ہوتا ہے جن سے انسانی فکر میں جذباتی تحرک پیدا ہوتا ہے اور وہ معتقدات اور مقاصد بن جاتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم میں (یعنی جنہوں نے اس تحریک سے وابستگی اختیار کی ہے ان میں) قدر مشترک یا وجہِ پیوستگی فکری وحدت ہے، اور ہماری غلط نگہی یہ ہے کہ ہم نے اسی کو کافی سمجھ لیا ہے۔ ہم میں جذبات و احساسات کی وحدت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں بھی (دوسرے لوگوں کی طرح) اکثر باہمی نزاعات اُبھرتی رہتی ہیں، حالانکہ جذباتی وحدت میں کسی قسم کی نزاع کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ یہ جو قرآنِ کریم نے مومنین کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ ..... بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (9/71) وہ ایک دوسرے کے جگری دوست ہوتے ہیں، تو اس قسم کے تعلقات جذباتی وحدت کے بغیر ممکن نہیں۔ محض فکری وحدت سے آپ میں، گھڑی کے پرزوں کی طرح، میکانکی تعاون تو پیدا ہو جائے گا۔ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ کی کیفیت پیدا نہیں ہو گی۔ گھڑی کے پُرزے ساری عمر محوِ گردش رہتے ہیں لیکن رہتے ہیں ویسے کے ویسے ہی۔ بلکہ وہ گھِس کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ارتقاء پیدا نہیں ہوتا۔ فکری وحدت زیادہ سے زیادہ اس قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے، انسانی کی داخلی دنیا میں تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اشتراک کے باوجود باہمی نزاعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ باہمی نزاع کی وجہ کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق مشہور روسی مفکر اوسپنسکی لکھتا ہے کہ

> انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لیے پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں۔
> (Tertium Organum – P. 200)

جذباتی وحدت

وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہتا ہے کہ آپ دیکھیئے۔ شراب پینے والے ایک دوسرے کے یار ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ شراب ان میں ایک جیسے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح بھنگ پینے والے ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں کیونکہ برگِ حشیش ان سب کو ایک ہی قسم کے افلاک کی سیر کراتی ہے۔ لیکن شراب یا بھنگ کے نشے، ایک تو عارضی ہوتے ہیں، اور دوسرے ان میں، انسانی فکر معطل اور مسلوب ہو جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جب ان کا نشہ اتر جاتا ہے تو وہ پھر حسبِ سابق ایک دوسرے کے دشمن یا مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم، جن جذبات کو وحدتِ فکر کی بنا پر ہم

آہنگ کرتا ہے، ان میں یہ نقص نہیں ہوتا.....نہ وہ عارضی ہوتے ہیں، اور نہ ہی ان میں فکر مسلوب یا معطل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ فکر کو اور جِلا دیتے ہیں۔ جن خوش بخت افراد میں اس قسم کی فکری اور جذباتی وحدت پیدا ہو جاتی ہے، قرآنِ مجید، ان کی زندگی کو جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس جنتی معاشرہ میں داخل ہونے والوں کی اوّلیں خصوصیت یہ ہو گی کہ وَنَزَعۡنَا مَا فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ (7/43) ان کے دلوں سے غِل نکال دیا جائے گا۔ یہ لفظ (غِلّ) ہے تو بہت چھوٹا سا لیکن معنی اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بہت وسیع ہے۔ بات سمجھنے کے لیے یوں کہیئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف گِرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی۔ غِل کے بنیادی معنی اسی قسم کی گِرہ سمجھ لیجیئے۔ اور اس گِرہ سے ایک دوسرے کے خلاف، کینہ، کدورت، حسد، انتقام، عداوت کی جو زہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو اس میں شامل کر لیجیئے۔ یہ ہے مفہوم غِلّ سے۔

جنتی زندگی

جنتی معاشرہ کی اوّلیں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غِل نہیں ہو گا۔ اسے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دُور کر دیا جائے گا۔ یہ گِرہیں کھول دی جائیں گی.....اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَنَزَعۡنَا مَا فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ إِخۡوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ (15/47) اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ "وہ تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے"۔ لیکن لفظ سُرُرٍ کا مادہ س۔ر۔ر ہے جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے (Face to Face) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دِلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو۔ يُلَقَّوۡنَ فِيۡهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا (25/75) وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے۔ یہ وہ جنتی معاشرہ ہو گا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہو گا۔ اس کے برعکس، جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا مَرۡحَبًا بِهِمۡ (38/59) وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے، اس لیے کہ ان کے دلوں میں غِلّ بھرا ہوتا ہے۔

اس غِلّ کے نکالنے میں عزیزانِ من! ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غِلّ کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ۔ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا، جیسے پھانس نکال دی جائے۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض قرار دے کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اب ماہرینِ علم النفس (Psychologists) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں۔ انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز پیوست ہو جاتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز، پھانس کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے.....پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لیے چین نہیں لینے دیتی۔ اب، ان تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کا علاج، تجزیہ نفس کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریقِ علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی امراض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، مَیں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کلی اعتماد ہونا چاہیئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آیئے قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ وَنَزَعۡنَا مَا فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ (7/43) ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنتی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہو گی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جا گزیں سرِّ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہو گی ان کے شرحِ صدر کی۔

عزیزانِ من! اگر آپ کے باہمی تعلقات کی کیفیت ایسی ہے تو پھر سمجھ لیجیئے کہ یہ تعلقات قرآنی رابطہ سے استوار ہیں۔ اگر ایسی کیفیت نہیں تو آپ کا ربطِ باہمی محض فکری اور میکانکی ہے۔ اس سے میکانکی نتائج تو مرتب ہوسکتے ہیں۔ قلب و نظر میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ جو قرآنی رابطہ کی بناپر ایک گروپ بننے کے مدعی ہیں، آپ کا یہ رابطہ کس زمرے میں آتا ہے!..... قلبی یا محض میکانکی؟

مجھے اس کا علم واحساس ہے کہ آپ احباب جو فکری طور پر اس تنظیم سے وابستہ ہوئے ہیں، تو آپ نے تقلیداً ایسا نہیں کیا۔ آپ نے پورے غور وخوض کے بعد اپنی سابقہ (غلط) روشوں کو چھوڑ کر علیٰ وجہِ البصیرت اس راستے کو اختیار کیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کا ہر قدم یہ آواز دیتا ہے کہ

حرم کو چھوڑ کے پیرِ حرم کہاں جاؤں کہ میں تو دیر و کلیسا سے ہو کے آیا ہوں

اس کے باوجود یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اس فکری رابطہ سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔ یہ بھی دیکھیں کہ آپ کی سیرت و کردار میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں جس کا مَیں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کے قلوب ایک دوسرے سے جُڑ گئے ہیں تو پھر سمجھیئے کہ قرآنی رابطہ کا مقصد پورا ہوا ہے، ورنہ نہیں..... لیکن اس کے بعد بھی آپ یہ نہ سمجھ لیجیئے گا کہ آپ باقی مسلمانوں سے الگ کوئی ممتاز افراد بن گئے ہیں۔ یاد رکھیئے، اپنے آپ کو "حقیقی" اور دوسروں کو "پیدائشی" مسلمان سمجھنا، یا اپنے آپ کو صالح اور باقی مسلمانوں کو غیر صالح قرار دینا، انانیت کے نفسیاتی مرض کا مظہر ہے جو احساسِ کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ (53/32) اپنے آپ کو یونہی مزکی نہ سمجھ لیا کرہ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اپنے آپ کو پستیوں میں گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایغو کے اس قسم کے وساوس سے محفوظ رکھے۔ آپ کی سیرت و کردار کو ایسا ہونا چاہیئے جس سے دنیا خود اندازہ لگالے کہ آپ کیسے ہیں۔

فرقہ بندی نہیں

آپ کی اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ بغیر فرقہ بنائے دین کی طرف دعوت دیتی ہے۔ یہ انداز سرسید (علیہ الرحمتہ) نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے بھی فرقہ بندی کو خلافِ اسلام قرار دے کر اپنا کوئی فرقہ نہیں بنایا تھا۔ لیکن فرقہ پرست اسے کیسے برداشت کرسکتے تھے! وہ جو مشہور ہے کہ کسی نے کُبڑی سے پوچھا کہ تمہارا کُب دور ہو جائے یا سب کُبڑے ہو جائیں، تو اس نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ سب کبڑے ہو جائیں۔ یہی حالت ہمارے فرقہ پرستوں کی ہے۔ سرسیدؒ نے ہزار چاہا کہ ان کبڑوں کا کُب ٹھیک ہو جائے لیکن انہوں نے نہ مانا، اور اسے بھی کُبڑا بنا کر چھوڑا۔ سرسیدؒ نے قوانینِ فطرت (Laws of Nature) کے مطالعہ اور مشاہدہ پر زور دیا تھا۔ اِنہوں نے اسے "نیچری" کہنا شروع کر دیا۔ اور اس سے نیچریوں کا ایک فرقہ بنادیا، اور خوش ہوگئے کہ ہم نے اِنہیں بھی اپنے جیسا بنادیا ہے۔ ان لوگوں نے یہی ٹیکنیک آپ کی تحریک کے سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے۔ ہمارے ہاں فرقوں کی باہمی سر پھٹول صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ ایک روایت کا حوالہ دے کر (جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل میں بہتّر فرقے تھے۔ میری اُمت میں تہتّر فرقے ہوں گے جن میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا اور باقی سب جہنّمی) ہر ایک فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے فرقوں کو جہنّمی ثابت کرنے کے جہاد میں مصروف رہتا تھا۔ طلوعِ اسلام نے پہلی بار یہ آواز بلند کی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ اس میں، اِس فرقے یا اُس فرقے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے ایسا قرآنِ مجید کی نصوصِ صریحہ کی سند کے ساتھ کہا۔ (دیکھیئے 30/31-32) اس کا جواب اِن کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ انہیں بھی ایک فرقہ بنادیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عالمِ خیال میں ایک فرقے کا وجود تخلیق کیا اور اسے پرویزی فرقہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ اس فرقے کا وجود خارج میں کہیں نہیں۔ صرف ان کے ذہنوں میں محبوس ہے اور ان کے جھوٹے پروپیگنڈہ کی رُو سے مشہور۔ جو لوگ تحریکِ طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر سے متاثر یا اس سے وابستہ ہیں، ان کی نہ کوئی الگ مسجد ہے، نہ وہ دوسروں سے مختلف کوئی اپنی نماز پڑھتے ہیں۔ نہ ان کے پرسنل لاز علیٰحدہ ہیں۔ وہ ان تمام امور میں امت کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، ہر محراب و منبر سے پرویزی فرقہ کا چرچا کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بانی مودودی صاحب نے جو یہ ارشاد فرمادیا کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ شرعاً واجب ہو جاتا ہے، تو اس نے "خدا پرستوں" کے لیے کذب وافترا کے

سب دروازے چوپٹ کھول دیئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب، اپنے مخالف کے خلاف، "خدا اور رسول" کے نام پر، ہر قسم کے جھوٹے الزامات تراشے جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کذب بافی پر کسی قسم کی ندامت ہو، اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ لیکن عزیزانِ من! اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اس دنیا میں یہ خدائی فوجدار، دوسروں کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے کے لیے لاکھ مسندِ عدالت پر اپنے آپ کو فائز سمجھ لیں، عدالتِ خداوندی میں تو یہ سب، دوسروں کے ساتھ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ وہاں اگر اس "خطاکار" سے سوال ہو گا کہ تم "حسبنا کتاب اللہ" کہتے تھے تو بصد احترام عرض کروں گا کہ ہاں حضور! کہتا تھا.....اور عمر بھر کہتا رہا!

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی　　اب اس کے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی!

****

لیکن آپ دیکھیئے، رفیقانِ گرامی قدر! کہ ان لوگوں کی طرف سے اس قدر بے پناہ مخالفت، اور آپ کی اس قدر بے سروسامانی کے باوجود، آپ کے مشن کو کامیابی کس قدر ہوئی ہے۔ آپ، تیس سال پہلے کی مذہبی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیئے اور، جن احباب کی عمر زیادہ ہے، وہ اُس زمانے کے وعظوں اور خطبوں کی یاد تازہ کریں۔ آپ کو ان میں، اور تو سب کچھ ملے گا، لیکن قرآن کا نام کہیں نظر نہیں آئے گا۔ لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ نہ کوئی مذہبی رسالہ ایسا ملے گا نہ کوئی کتاب جس میں قرآنِ مجید کا نام نہ لیا گیا ہو۔ نہ کوئی محراب و منبر ایسا ہو گا جہاں اپنی بات کے ساتھ قرآن کی آیت نہ ضم کی جاتی ہو، اور نہ ہی کوئی اسٹیج جہاں اپنے دعوے کی نسبت اس کتاب کی طرف نہ کی جاتی ہو۔ خواہ وہ نسبت یا دلیل غلط ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ اب تو دبستانِ حکومت اور ایوانات پارلیمان تک میں اس کے تذکرے سنائی دینے لگے ہیں۔ سوچیئے کہ اتنی بڑی تبدیلی کس کی نواگری کا صدقہ ہے۔ آپ بے نواؤں کی والہانہ کاوشوں کا! اس تبدیلی کی اس سے بھی زیادہ دلچسپ مثال ملاحظہ کیجیئے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، ہمارے ہاں ہزار برس سے مذہبی فرقے چلے آرہے تھے۔ طلوعِ اسلام نے جو نصوصِ قرآنی کی رُو سے بتایا کہ فرقہ بندی شرک ہے تو اس کا کوئی جواب ان سے بن نہ پڑا۔ لیکن آپ کی اس بے باکانہ حق گوئی کا اثر یہ ہوا کہ یہ حضرات اپنے آپ کو فرقہ کہنے سے شرمانے لگے۔ چنانچہ اب ان کی طرف سے یہ آواز بلند ہونی شروع ہو گئی ہے کہ یہ فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں۔ ہر چند ان کی یہ خود فریبی یا فریب دہی، کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے کے مترادف ہے، لیکن اس سے اتنا تو واضح ہے کہ آپ کی اس پکار سے یہ اپنے آپ کو فرقہ کہنے سے جھینپنے لگے ہیں۔ یہ ہیں آپ کی دعوت الی القرآن کے وہ نتائج جو غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جارہے ہیں۔ آپ کے (یا بالفاظ صحیح یوں کہیئے کہ آپ کی قرآنی آواز کے) خلاف پھیلائی ہوئی تاریکیاں بظاہر بڑی دبیز اور وحشت انگیز نظر آتی ہیں، لیکن آپ کو ان کا کوئی اثر نہیں لینا چاہیئے۔ جھوٹ کے تو پاؤں ہوتے ہی نہیں۔ اس لیے

ظلمتِ شام سے اندازۂ انجام نہ کر!　　رات کی رات میں انجام بدل سکتا ہے

****

اس کے بعد دو ایک ضروری تنبیہات۔ میں نے آپ سے ایک بار کہا تھا کہ آپ کی صفوں میں ایسے لوگ گھستے چلے جارہے ہیں جو قرآن کے نام سے خلافِ قرآن خیالات پھیلاتے رہتے اور انہیں منسوب آپ کی طرف کرتے رہتے ہیں۔ میں نے متنبہ کیا تھا کہ آپ احباب ان سے خاص طور پر محتاط رہیں اور انہیں اپنے قریب نہ آنے دیں۔ اب انہوں نے ایک اور انداز اختیار کیا ہے۔ مجھے اکثر ایسے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ میں ایک عرصے سے طلوعِ اسلام، ترجمان القرآن یا بلاغ القرآن وغیرہ رسائل کا مطالعہ کرتا چلا آرہا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ سب کی دعوت ایک ہی ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اُن کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ مَیں جواب میں یہ کہا کرتا ہوں کہ اگر آپ واقعی نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو میرا آپ سے مخلصانہ مشورہ یہ ہے آپ جو جی میں آئے پڑھیئے لیکن طلوعِ اسلام کا مطالعہ کرنے میں اپنا وقت، توانائی اور پیسہ ضائع نہ کریں۔ آپ کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ آپ طلوعِ اسلام کی دعوت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس میں اور مذہبی رسالوں کی دعوت میں فرق کر سکیں۔ میری آپ احباب سے درخواست ہے کہ اگر آپ اپنی صفوں میں ایسے لوگوں کو دیکھیں تو انہیں اپنوں میں سے نہ سمجھیں۔ اگر وہ کسی سازش کے ماتحت

ایسا نہیں کہتے.....نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں، تو بھی وہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کی دعوت منفرد ہے اور، کوئی اور دعوت اس کے مماثل نہیں۔ طلوعِ اسلام اُس دین کی طرف دعوت دیتا ہے جو عہدِ محمد رسولؐ اللہ والذینؓ معہٗ میں نافذ تھا۔ دوسرے گوشوں کی طرف سے، اسلام کے نام پر اُس مذہب کی دعوت دی جارہی ہے جو ہمارے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا۔ طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اسلام، زندہ نظام (الدین) کی شکل صرف اسلامی مملکت میں اختیار کر سکتا ہے۔ اسلامی مملکت کی عدم موجودگی میں، مذہب ہوتا ہے، دین نہیں ہوتا۔ اسلامی مملکت سے مراد ایسی مملکت ہے جس کا جملہ کاروبار، خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ مذہب میں، قوانینِ شریعت (یعنی فقہی احکام) افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں، خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ دین میں قانون سازی کا اختیار صرف مملکت کو ہوتا ہے، اور اس کے مرتب کردہ اور نافذ کردہ قانون کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس طرح اس میں امتِ واحدہ ہوتی ہے، فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اور جب فرقوں کا وجود نہیں رہتا تو مذہبی پیشوائیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مذہب سرمایہ داروں کے بل بوتے پر زندہ رہتا اور پنپتا ہے۔ دین میں سرمایہ داری کی جڑیں تک کٹ جاتی ہیں۔ طلوعِ اسلام کی دعوت، موجودہ مذہبِ اسلام کی جگہ الدین کو متمکن کرنا ہے۔ یہ تبدیلی اسلامی مملکت ہی کر سکتی ہے، افراد نہیں۔ لہٰذا طلوعِ اسلام الدین کی خصوصیات اور امتیازات تو پیش کرتا ہے، اُمت جس طرح مذہبی شعار (نماز، روزہ وغیرہ) کی پابندی کرتی چلی آرہی ہے، ان میں کس قسم کی تبدیلی نہ خود کرتا ہے، نہ کسی کو اس کا مجاز سمجھتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام کا اپنا کوئی الگ فرقہ نہیں، یہ ہے طلوعِ اسلام کی دعوت اور اس کا مسلک۔ اور یہی ہے مجھ بے نوا کی وہ صدا جسے قرآن کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے، قریہ قریہ، بستی بستی، بلند کیے چلا آرہا ہوں۔

پکارتا ہوا ہر رہگذر پہ نام ترا　　پہنچ گیا ہوں کہاں سے کہاں! خدا جانے

اور آخر میں عزیزانِ من! ایفائے عہد.....سالِ گذشتہ کی کنونشن میں، مَیں نے مطالب الفرقان کی جلد اوّل، آپ احباب کی خدمت میں بطور نذرانۂ محبت پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی، (ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ میں نے وعدہ کیا تھا یا آپ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا! کہ) اس کی دوسری جلد، حالیہ کنونشن میں نذرِ احباب کرنے کی کوشش کروں گا۔ سو لیجئے! وہ تحفۂ محبت پیشِ خدمت ہے.....یارب! یہ میری نذرِ محقر قبول ہو.....تفصیل اس کی آپ کو اس کے تعارف میں ملے گی۔ میں جب بھی اپنی بصیرتِ قرآنی کے کسی ماحصل کو محسوس شکل میں پیش کرتا ہوں تو علامہ اقبالؒ کی یہ دعا بے ساختہ میری زبان پر آجاتی ہے کہ

گر دِلم آئینۂ بے جوہر است　　در بحر فم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن　　ایں خیاباں رازِ خارم پاک کن!
گر دُرِ اَسرارِ قرآں سفتہ ام　　با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا　　آبِ نیسانم، گہر گرداں مرا

اسی دُعا کے ساتھ میں اپنے اس افتتاحیہ کو ختم کرتا ہوں۔ والسلام

پرویز

۲۱ اکتوبر ۱۹۷۶ء

****

کمپوزنگ محمد افتخار الحق